کی زبان الگ لب ولہجہ الگ امیجری الگ آپ اپنے ہمعصر نئے شاعروں سے اتنے الگ کیوں نظر آتے ہیں؟''

بولے ''میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ اصیل شاعری تو اس طرح وارد ہوتی ہے جیسے یک لخت بارش کا چھینٹا پڑے۔ اس کی وضاحت کیسے ہوسکتی ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جیسے ہر اصیل شاعر ایک نجی متھ لے کر ظاہر ہوتا ہے' ایسے ہی میرے پاس بھی ایک نجی متھ ہے۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے ایک چٹیل میدان ہے۔ اس میں دو گھوڑے اسپ سیاہ اور اسپ سفید دوڑ رہے ہیں اور کسی شے کی تلاش میں ہیں۔ پھر ایک گھنا جنگل ہے۔ گھنے جنگل کے بیچوں بیچ ایک چاند رہے۔ میں اس چاند تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کی نجی متھ سر آنکھوں پر۔'' میں نے کہا ''مگر ایک چیز اجتماعی متھ بھی ہوتی ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' تھوڑا سوچ کر بولے۔ ''ایک تو قرآن کا لحن ہے جو میں نے بچپن سے سنا اور میرے اندر سما گیا اور ایک حضور پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات اقدس۔'' اور اسی کے ساتھ صلاح الدین محمود کے جسم میں ایک تھرتھری دوڑ گئی۔ بتاتے تھے کہ جب وہ مکہ گئے تھے تو ایک رات؟ غار حرا میں گزاری۔ پھر بڑی محنت سے ایک نقشہ تیار کیا اور اس راستے کا تعین کیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم چل کر مکہ سے مدینہ پہنچے تھے۔ منصوبہ بنایا تھا کہ اس راستہ پر پیدل چل کر منزل مقصود تک پہنچیں مگر آخر کیوں؟ اسے وہ نقش اول کہتے تھے اور وضاحت اس طرح کرتے تھے کہ میں اس پاک وقت تک پہنچنا چاہتا ہوں جس پاک وقت میں حضور پاک نے سانس لیا تھا۔ اس وقت میں جو لہو کی گردش تھی' اس گردش کو میں اپنے لہو میں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔

مدینہ پہنچ کر مجھے خط لکھا۔

انتظار حسین صاحب!

رسول اللہ سے ایک بار پھر میں نے اپنے حواس کی ازلی پاکیزگی مانگی ہے۔ تاکہ حاضر حیات کے اس میدان میں دوبارہ پہلا قدم دھر سکوں۔ اور کائنات کی تمام جنبش کا نقش اول پا سکوں۔

صلاح الدین محمود

مدینہ منورہ

رجب 1403ھ

مگر اس کے بعد یوں ہوا کہ ایک شام انہوں نے دوستوں کو مدعو کیا کہ ایک نادر شے دستیاب ہوئی ہے۔ اس سے آپ کو متعارف کرانا ہے۔ دوست جمع ہوئے۔ چائے پی۔ جب شام ڈھل گئی اور رات ہوگئی تو انہوں نے روشنیاں گل کر دیں۔ اندھیرے میں

ریکارڈ بجنا شروع ہوا۔ یہ سبھ لکشمی کا لانگ پلے ریکارڈ تھا۔ میرابائی کے بھجن' سبھ لکشمی کی آواز' صلاح الدین محمود کے لیے اسے سننا عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے کہ جب سبھ لکشمی کی آواز میں یہ سنتا ہوں کہ پربھو آ دو' پربھو آ دو تو مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ بس سمجھ لیتا ہوں کہ پربھو آ گئے۔

میں نے کہا ''صلاح الدین! آپ خوب آدمی ہیں۔ ادھر قرآن کے لحن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات سے اتنی عقیدت' اتنا استغراق اور ادھر میرابائی سے اتنا عشق۔''

بولے ''میرابائی کے بغیر تو میرا اسلام مکمل نہیں ہوتا۔'' پھر وضاحت کرنے لگے۔ ''انتظار صاحب! میں خلا میں تو پیدا نہیں ہوا ہوں۔ ان مسلمانوں کی اولاد ہوں جو نو سو برس سے یہاں رچے بسے چلے آ رہے تھے۔ کھجور کا پیڑ مدینہ منورہ سے لا کر یہاں لگایا جائے گا تو کھجور کے ذائقہ میں تھوڑا فرق تو آئے گا۔''

''مگر آپ کو تو نقش اول کی جستجو ہے؟''

''ہاں وہ بھی ہے۔ دیکھئے بیج سے درخت بنتا ہے۔ جب درخت بن جاتا ہے تو اس کی شکل ہی اور ہوتی ہے۔ ہر رنگ کا پرندہ اس پر آ کر بیٹھتا ہے مگر اس درخت کو کبھی کبھی تو یہ خیال آتا ہوگا کہ بیج کی جو اولین چیخ تھی' اسے سننا چاہیے۔ تو میں بھی بیج کی اولین چیخ سننا چاہتا ہوں۔ بیج جو حضور پاک کے وقت میں چٹخا تھا اور اس سے کونپل پھوٹی تھی۔''

ایک روز وقت طے کر کے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے ''آپ نے خیال کا سن ستاون نمبر نکالا تھا۔ یہ بتایئے کہ عظیم اللہ خان کے بارے میں آپ کے پاس کتنا مواد ہے؟''

میں نے کہا ''صلاح الدین صاحب! کیوں آپ ہمیں شرمندہ کرتے ہیں۔ ارے اس کے متعلق جاننے کی خاطر میں اکیلے نے نہیں سعید محمود نے بھی لائبریریاں چھان ڈالیں۔ تھوڑی سی معلومات سے آگے کچھ ملا ہی نہیں۔''

بولے ''یہ شخص مجھے بہت Fanscinate کرتا ہے۔ میں نے اس کے متعلق خاصا مواد جمع کیا ہے۔ اس کا خاصا وقت لندن میں گزرا۔ ڈکنس سے اس کی دوستی تھی۔ وہاں اونچی سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ میمیں اس پر ریجھی ہوئی تھیں بلکہ جس ستاون کی شکست کے بعد آزادی کے سپاہی یہاں سے فرار ہوئے تو کچھ میموں نے اپنے اثر رسوخ سے اس کی یہاں سے نکلنے میں مدد کی۔'' میں نے کہا جب آپ اس شخص پر کام کر رہے ہیں تو اختر حسین رائے پوری کے ایک بیان کی روشنی میں بھی تھوڑی چھان بین کر لیجئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اپنی کھٹمنڈوں کی یادوں کے ذیل میں لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے اس شہر میں پناہ لی تھی اور یہ کہ وہ

1947ء کے کئی سال بعد تک جیتا رہا۔ اس نے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں جو اس نے مولانا ابوالکلام کو بھجوادی تھیں۔

''ویسے تو اس کا اتنی عمر پانا قرین قیاس نظر نہیں آتا۔ پھر بھی سوچنا تو چاہیے کہ آخر انہوں نے کون سے شواہد کی بنا پر یہ بات کہی ہے۔''

افسوس کہ صلاح الدین کے باقی منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی تشنہ تکمیل ہی رہا مگر اس میں ان کی اپنی خطا نہیں تھی۔ اس موقع پر فرشتہ اجل نے عجلت دکھائی مگر خیر یہ ظالم فرشتہ بھی ان کے رکھ رکھاؤ میں ایسا خلل تو نہیں ڈال سکا۔ بس یوں ہوا کہ اچانک ایک صبح ان کی طبیعت بگڑی۔ خون کی قے آئی۔ کلی کر کے باتھ روم سے نکلے۔ بستر پر دراز ہو گئے۔ اس طرح کہ لباس پر شکن نہ پڑے۔ ایک ہچکی لی اور گزر گئے۔

اچھا تو میں کیا بات کر رہا تھا۔ ہاں حلقہ ارباب ذوق ادبی کی بات ہو رہی تھی۔ ادبی حلقہ اور سیاسی حلقہ لگتا تھا کہ دو الگ دنیائیں ہیں۔ یہاں ادب زیر بحث ہوتا۔ سیکرٹری سہیل احمد خان تھے جو اس وقت تنقید کے میدان میں ایک ابھرتے ہوئے روشن ستارے کا تاثر دیتے نظر آتے تھے۔ اسی حساب سے شاعری اور افسانے میں کچھ نئی سمت کنمناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جس کے یہاں ادب کی چٹیک تھی اور لکھنے لکھانے کی آرزو۔ وہ اس طرف دوڑتا ہوا آتا اور اس محفل میں جہاں گنے چنے لوگ ہوتے' شریک ہوتا۔

ادھر حلقہ ارباب ذوق سیاسی میں عزیز الحق کے انقلاب کا گھوڑا بگٹٹ دوڑ رہا تھا۔ ساری حدیں پھلانگتا چلا جا رہا تھا۔ بس ایک دم ہی پٹخنی کھائی۔ ایک چیلی کے جلے بھنے شوہر کی گولی کا نشانہ بنا اور دم کے دم میں وہ شعلہ کی مثال بھڑکتی جان ٹھنڈی ہو گئی۔

عزیز الحق کے گزرنے کے بعد حلقہ کے انقلابی بے آسرا ہو گئے۔ جو ادب کے نام صفر تھے اور خالی انقلاب کے نعرے کے سہارے دندناتے تھے' وہ جلد ہی غائب غلہ ہو گئے۔ جو انقلاب اور ادب کی کھچڑی پکا رہے تھے' ان کا یہ ہوا کہ جس کے جدھر سینگ سمائے' ادھر نکل گیا۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ٹی ہاؤس کے حلقوں میں سعادت سعید کی دوپلی ٹولی نے پائی۔ اس نے انقلاب کا ٹوپا اتار کر دوپلی ٹولی سر پر منڈھ لی اور پی ای این کے مولویوں کی امامت میں نمازیں پڑھنے لگا۔

اب حلقہ میں چنکبرے انقلابی رہ گئے تھے۔ سو انتہا پسندی کا دور ختم ہوا۔ روئے میں اعتدال پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دونوں حلقوں میں صلح صفائی کی تحریک شروع ہوئی۔ بار بار مذاکرات ہوئے جیسے ہندوستان اور پاکستان کے بیچ ہوتے ہیں کہ امیدوں کے ساتھ شروع ہوتے ہیں اور ناکامی پر ختم ہوتے ہیں۔ آخر کے تئیں وہ زمانہ آ گیا کہ نہ حلقہ ارباب ذوق سیاسی رہا' نہ حلقہ ارباب ذوق ادبی رہا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء نے دونوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ دونوں کو اپنی دکان بڑھانی پڑی۔

ہاں اسی ہنگام جب حلقہ میں افراتفری پڑی تھی اور وہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا تو قیوم نظر نے گوشہ نشینی کو ترک کیا۔ اپنے پرانے

خلقی رفقا وانصار کو اکٹھا کر کے اپنا حلقہ ارباب ذوق چالو کیا۔ کتنے دنوں تک ہم یہ سنتے رہے کہ قیوم صاحب جمعہ کے جمعہ اپنے رفقاء و انصار کو کہیں مسلم مسجد کے اس پاس کسی گوشے میں جمع کرتے ہیں۔ وہاں حلقہ کا جلسہ ہوتا ہے۔ جب ادھر دونوں حلقوں نے اپنی دکان بڑھادی تو قیوم صاب کے حلقہ کے لیے فروغ پانے کے خاصے امکانات تھے مگر اسی زمانے میں قیوم صاحب کی صحت جواب دے گئی۔ باقی ان کے کسی رفیق میں اسے سنبھالے رکھنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ حلقہ گوشہ گمنامی میں شروع ہوا اور گوشہ گمنامی ہی میں آخری سانس لے کر ختم ہو گیا۔

جب ایک ایک کر کے سارے حلقے نبڑ گئے اور ان کے بنانے بگاڑنے والے دبک کر اپنے اپنے کونوں میں بیٹھ گئے' تب لاہور کے ادبی افق پر مبارک احمد نمودار ہوئے۔ ٹی ہاؤس میں پہنچ کر انہوں نے حلقہ کی تجدید کا بیڑا اٹھایا اور یاران حلقہ کو جھنجھوڑ کر جگایا۔

مبارک احمد کی کیا پوچھتے ہو۔ حلقہ کی پرانی ہڈی ہیں۔ میراجی کے وقتوں سے ویسے کے ویسے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اسی وقت سے سائیکل اور نئی شاعری یہ دو چیزیں ان کے دم کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ سائیکل تو جیسی تب تھی' ویسی ہی اب ہے۔ ہاں نئی شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ پہلے نظم آزاد لکھتے تھے۔ جب نئی شاعری نے نثری نظم کو جنا اور سب طرف سے اسے شاعری کی حرام اولاد بتا کر تھڑی تھڑی ہونے لگی تو انہوں نے نومولود کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کی حفاظت اور پرورش اپنے ذمے لے لی۔ اس بچے کی پرورش کرتے کرتے مبارک احمد بقول خود ''کرہ ارض کے نمائندہ شاعر'' بن چکے ہیں۔ آگے ایک طویل نظم ''زمانہ عدالت نہیں ہے۔'' لکھی تھی۔ یاروں کو بتایا کہ انہوں نے یہ نظم اقوام متحدہ کے چارٹر کی تکر پر لکھی ہے۔

جب دیکھا کہ شاعری سے کام نہیں چل رہا تو بہت غور وفکر کے بعد ایک دن گجرات سے چل کر لاہور پہنچے۔ ٹی ہاؤس میں دوستوں کو جمع کیا اور اعلان کیا کہ میں نے عالمی حکومت کا ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت بڑی قوموں کو مجبور کیا جائے گا کہ چھوٹی قوموں کی مدد کریں۔

''بڑی قوموں کو مجبور کون کرے گا؟'' یہ سوال ان کے دوستوں میں سے یوسف کامران نے اٹھایا۔

''میں مجبور کروں گا۔'' مبارک احمد نے قطعی لہجہ میں کہا۔

''اگر آپ کی بات بڑی قوموں نے نہ مانی تو کیا ہوگا؟''

''تو پھر میں عالمی رائے عامہ کو ان کے خلاف بیدار کروں گا۔''

مبارک احمد کو اس مشن میں ایک ہاتھ بٹانے والے کی ضرورت تھی۔ قرعہ فال اعجاز حسین بٹالوی کے نام نکلا۔

''ان سے پوچھ تو لیجئے۔'' کسی نے کہا۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس میں شرکت سے انکار ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''پھر بھی اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟''

''تو پھر میں ان کے خلاف عالمی رائے عامہ کو جھنجھوڑوں گا۔''

اس منصوبے کو وہ عملی جامہ پہنانے لگے تھے کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ اس ہنگامی صورتحال کے تحت انہوں نے اپنی عالمی حکومت کے منصوبے کو تھوڑے عرصے کے لیے ملتوی کیا اور پاکستان میں جمہوریت کی حفاظت کی ذمہ داری تک اپنے آپ کو محدود کر لیا۔

مبارک احمد ویسے تو سب ہی عورتوں کے دلدادہ ہیں مگر دو عورتیں ایسی ہیں جن کے لیے وہ جان بھی دے سکتے ہیں۔ اول بے نظیر بھٹو دوم ہیما مالنی۔ ہیما مالنی کی شان میں انہوں نے ایک نظم لکھی تھی۔ جب رام لال پاکستان آئے تو انہوں نے یہ امانت ان کے سپرد کی اور کہا کہ یہ نظم آپ کو خود بمبئی جا کر ہیما مالنی کو پہنچانی ہے۔''

ویسے سب سے زیادہ نظمیں انہوں نے دو عورتوں کے بارے میں لکھی ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے بارے میں اور کشور ناہید کے بارے میں۔ کشور ناہید کو وہ ایک زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ بتاتے تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد انہیں یہ رائے تبدیل کرنا پڑی۔ پھر انہوں نے یہ اعزاز سارہ شگفتہ کو دیا۔ سارہ شگفتہ کے انتقال کے بعد وہ متذبذب رہے کہ اب یہ عزت کس شاعر کو دی جائے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے اس فیصلہ سے انہوں نے مجھے آگاہ کیا۔ وہ جون کی ٹیکا ٹیک دوپہر تھی' جب انہوں نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ مبارک احمد سائیکل لیے کھڑے ہیں۔ پسینہ میں شرابور ہیں۔

''خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولے ''بس ایک خبر تمہیں دینے آیا ہوں۔''

''کیا خبر ہے؟''

''میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عذرا عباس ٹی ایس ایلیٹ سے بڑی شاعرہ ہے۔''

میں حواس باختہ ان کی صورت تکنے لگا۔

''صحیح کہہ رہا ہوں۔ ایلیٹ کی نظم ''ویسٹ لینڈ'' عذرا عباس کی نظموں کے مقابلہ میں.......

میں نے جھرجھری لی۔ فوراً ان کی بات کاٹی ''مبارک صاحب! بس کریں۔ گرمی بہت ہو رہی ہے۔ آپ کی اطلاع کا شکریہ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے اپنا پیغام آپ کو پہنچا دیا ہے۔'' سائیکل پر سوار ہوئے۔ یہ جاوہ جا۔ مطلب یہ کہ مبارک احمد جس کا بیڑا اٹھاتے ہیں' اس کے لیے جان لڑا دیتے ہیں اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں تو اب انہوں نے حلقہ کی تجدید کا بیڑا اٹھایا تھا اور واقعی انہوں نے حلقہ کو زندہ کر دکھایا اور اس طرح زندہ کیا کہ سیاسی حلقہ اور ادبی حلقہ کی تقسیم ہی ختم ہو گئی۔ حلقہ ارباب ذوق اب صرف حلقہ ارباب ذوق تھا۔

حلقہ جب چل نکلا تو انہوں نے اسے سلام کیا اور پھر نثری نظم کے فروغ کے مشن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ نثری نظمیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیئے۔ پھر ''کلیات'' چھپوائی اور اعلان کیا کہ اس کلیات کو لے کر جس میں آ کے ہر سوال کا جواب موجود ہے اور نثری نظم کا پیغام عظیم دیا گیا ہے' دنیا کے سفر پر نکلوں گا۔ پہلے امریکہ جاؤں گا۔ اگر اس نے مثبت جواب نہ دیا تو آسمان کی طرف منہ کر کے تھوکوں گا کہ تھوک میرے ہی منہ پر پڑے کہ امریکہ تو کیا دنیا کے کسی ایک شخص کو بھی دکھ دینا نہیں چاہتا۔''

تو اس کینڈے کے آدمی ہیں مبارک احمد۔ دھن کے پکے۔ جس وقت جو بھی دھن سوار ہو جائے' پھر رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کو ڈوبتے دیکھا تو ضبط نہ ہو سکا۔ اس میں جت گئے اور جیسے تیسے کر کے اس کھٹ بگڑی گاڑی کو چالو کر دیا۔ اب اگر اس کا پچھلا معیار اور وقار واپس نہیں آیا تو اس میں قصور ان کا نہیں' زمانے کا ہے۔ اب پاکستان کے سارے ہی ادارے اپنا وقار کھو چلے تھے۔

حلقہ کی کچھ روایات ساری خرابی کے باوجود یہاں بھی برقرار دیکھی گئیں۔ ایک روایت یہ چلی آتی تھی کہ کوئی ایک سر پھرا پہلا پتھر پھینکنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا۔ کوئی مضمون ہو' کوئی مسئلہ۔ اس میں اسے درک ہو یا نہ ہو مگر پہلا پتھر پھینکنے کا فریضہ بہر حال ادا کرنا ہے۔ کسی زمانے میں رحمن مذنب کیل کانٹے سے لیس بیٹھے رہتے تھے۔ ادھر مضمون ختم ہوا' ادھر وہ جاری ہو گئے۔ یونانی دیومالا سے بسم اللہ کرتے اور پھر چل سو چل۔ اسی کے آس پاس کے زمانے میں شاد امرتسری نے پہلا پتھر پھینکنے والے کی حیثیت سے سر اٹھایا۔ مقالہ ہو' افسانہ ہو' نظم ہو' غزل ہو۔ وہ ہر مضمون میں رواں تھے اور اس شان سے کہ پڑھنے والا تحریر ختم کر کے سانس لینے نہیں پاتا تھا کہ شروع ہو جاتے۔ حلقہ کے دولخت ہونے کے آس پاس کے زمانے میں اکبر لاہوری نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ اکبر لاہوری عمر کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے کہ حلقہ کی طرف مائل ہوئے۔ بینائی جاتی رہی تھی۔ بیٹی عصائے پیری بنی ہوئی تھی۔ اس کے سہارے حلقہ میں پہنچتے اور اس پابندی کے ساتھ کہ نمازی کی نماز قضا ہو جائے۔ ان کا حلقہ میں آنا قضا نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت سے پہلے کہ ابھی ہال خالی پڑا ہوتا کہ وہ وارد ہوتے اور اپنی طے شدہ نشست پر شست باندھ کر بیٹھ جاتے۔

مبارک احمد کے تجدید کردہ حلقہ میں یہ ذمہ داری خان فضل الرحمن خان نے سنبھالی۔ کیا نرالے بزرگ تھے۔ لمبے لگ لگ' جسم

سینک سلائی' سر سارا سفید' وقت پر ٹی ہاؤس میں قدم رکھتے۔ پہلے چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے۔ پھر بالائی منزل میں جا کر حلقہ کے جلسہ میں شریک ہوتے اور وہاں جو کچھ پڑھا جاتا' اسے اسلامی معیار پر پرکھتے اور رد کر دیتے۔ تحریر میں فحاشی کو بہت جلدی سونگھ لیتے تھے یہ الگ بات ہے کہ خود ان کے ناولوں' افسانوں میں یہی رنگ خوب بہار دکھاتا تھا۔ آخر یاروں سے رہا نہ گیا اور ان کے ایک ناول کا حوالہ دے کر کہا کہ اس ناول میں تو آپ نے حد کر دی۔ ہیرو سارے مزے لوٹ کر آخر لواطت کی طرف چل پڑتا ہے۔ افسوس سے کہنے لگے کہ ''کمبخت کو میں نے بہت روکا مگر وہ رکا ہی نہیں۔ میں کیا کرتا۔''

''مگر آپ کے دوسرے کردار بھی بہت جلدی کھل کھیلتے ہیں۔''

بولے ''کیا بتاؤں میرے کردار میرے قابو میں نہیں رہتے۔ میں تو ان کی اصلاح کی بہت کوشش کرتا ہوں مگر مخرب اخلاق حرکتوں سے باز نہیں آتے۔''

شاہد حمید نے ٹالسٹائی کے ''وار اینڈ پیس'' کا ترجمہ کیا۔ حلقہ کی ایک نشست میں اس پر گفتگو کا اہتمام ہوا۔ ٹالسٹائی کے بارے میں کہنے والوں نے جو کچھ کہا اسے خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر ایک دم سے ابل پڑے۔ بولے اگر ٹالسٹائی اتنی ہی عظیم شخصیت تھا' جتنا آپ لوگ بتا رہے ہیں تو پھر وہ مشرف بہ اسلام کیوں نہیں ہوا۔''

◆◆◆

جرنیلی زمانہ

یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ روزہ نماز کا بہت چرچا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب جونیجو صاحب وزیراعظم بنے تو رمضان آنے پر افطار پارٹی کی تقریب سے بہت سے صحافیوں کو یاد کیا گیا۔ مدعوین میں میرا بھی نام تھا۔ وزیراعظم ہاؤس میں ایک شام جنرل ضیاء الحق کی طرف سے افطار کا اہتمام تھا۔ دوسری شام جونیجو صاحب کی افطار پارٹی کے لیے وقف تھی۔ پہلی شام یوں ہوا کہ افطار کرتے کرتے جنرل صاحب نے اذان کی آواز سنی اور فوراً اس سمت چلے جہاں نماز کا اہتمام تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے پورا ہجوم۔ کیا صحافی' کیا غیر صحافی۔ میں نے دیکھا کہ پیچھے ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ پھر ادھر ادھر نظر ڈالی تو دور ایک گوشے میں ایک درخت تلے ڈان والے احمد علی خان کھڑے نظر آئے۔ میں لپک کر ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ظفر صمدانی بھی کسی طرف سے آن نکلا ہے۔ ایک ڈیڑھ دانہ اور لڑھکتا پڑکتا اس ٹولی میں آن شامل ہوا۔

اگلی شام وہی مقام' اسی طرح سے افطار کا اہتمام۔ اسی طور اذان کی آواز مگر ہوا یہ کہ جونیجو صاحب جب نماز کے لیے چلے تو بس چند گنے چنے نگ ان کی معیت میں تھے باقی سب افطاری میں مشغول نظر آئے۔

اس سے میں نے یہ جانا کہ نماز برحق مگر دیکھنے والے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دعوت نماز کس طرف سے ہے۔ بھٹو صاحب ویسے تو بہت دانا بینا تھے مگر اسلام کا علم بلند کرتے وقت اس نکتہ کو فراموش کر گئے۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام' جمعہ کی چھٹی' گھڑ دوڑ پر پابندی' شراب پر پابندی مگر عجب ہوا کہ ایسے کام انجام دینے کے بعد بھی ان کی مسلمانی مشکوک ہی رہی۔ ہاں یہ جو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام تھا' اس کا تھوڑا اثر ہماری دوستیوں پر بھی پڑا۔ میں غالب احمد کو کب سے مسلمان سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ اچانک پتہ چلا کہ وہ تو غیر مسلم ہے۔ مجھے تو خیر جانے دو' ہمارے دوستوں کے حلقہ میں اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تو اپنے شیخ صلاح الدین چلے آ رہے تھے۔ ان کے دو ہی تو محبوب موضوعات تھے۔ وقت کا مسئلہ اور اسلام۔ انہوں نے اسلام کے بیج سے کیسا کیسا فلسفہ کشید کر کے ہمارے ذہن نشین کیا تھا مگر حیف کہ غالب احمد کی نامسلمانی ان کی نظروں سے اوجھل رہی۔ اس انکشاف کی سعادت ہمارے سیکولر رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی۔

خیر دوستی تو نبھانی تھی۔ کتنے زمانے سے اس یار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں نے سوچا کہ آئین دوستی کا تقاضا یہ ہے

کہ اب جبکہ دوست مسلم سے غیر مسلم بن گیا ہے تو اس حادثے پر اس سے جا کر اظہار ہمدردی کیا جائے یا تعزیت کی جائے۔

میرے ہوتے ہوئے میرے سوا جو دوسرا دوست غالب احمد سے تعزیت کرنے آیا تھا' وہ حیات احمد خان تھے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بھٹو صاحب نے اپنی طرف سے ایسے کتنے قدم اٹھائے کہ مولویوں کو ان کے اسلام کا قائل ہو جانا چاہیے تھا مگر عجب ہوا کہ یار و اغیار نے ان اقدامات پر اعلان تاشقند والا نسخہ اثر کر گیا اور جیسے ان کا اسلامی سوشلزم کا نعرہ چل گیا' ویسے یہ اسلام کے حوالے سے بھی کامیابی ان کے قدم چومے گی مگر اس میدان میں کامیابی کسی اور کے نام لکھی گئی تھی۔ کیا یہ نیتوں کے فرق کی وجہ سے ہوا یا طریقہ واردات کے اختلاف کے باعث۔ اس گتھی کو آپ سلجھاتے رہیے۔ بہر حال واقعہ یوں ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے اسلام کا نام لیا اور کامیاب ٹھہرے اور ان کی نماز کی تحریک تو واقعی بہت موثر ثابت ہوئی۔ راتوں رات کتنے بیوروکریٹ نمازی بن گئے اور دفتر دفتر نماز کی صفیں بچھ گئیں۔ ہمارے ''مشرق'' کے دفتر میں چند گنے چنے پکے نمازی چلے آتے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا اور انہوں نے قلم رکھ کر قریب کی مسجد کا رخ کیا مگر اب اچانک دفتر کا دفتر نمازی بن گیا۔ ظہر کا وقت ہوا۔ ادھر سے ضیاء اسلام انصاری جو ضیاء الحق کی نظر کرم سے اخبار کے چیف ایڈیٹر بن گئے تھے' اپنے کمرے سے نکلے اور ادھر کیا خوش نویس اور کیا اخبار نویس اپنی اپنی نشست سے اٹھے اور نماز کے لیے صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

دروغ بر گردن راوی' سننے میں آیا کہ دفتروں' اداروں میں جو نماز نہیں پڑھتے' ان کی نام نوٹ کیے جاتے ہیں اور جو پابندی سے یہ فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں' انہیں ترقی دینے کا معاملہ زیر غور ہے۔ اس خبر یا افواہ نے خاطر خواہ اثر کیا۔ دفتروں میں نمازوں کی صفیں اور لمبی ہو گئیں۔

اس صورتحال نے ثقافتی' ادبی اور علمی اداروں کو بھی متاثر کیا۔ لاہور آرٹ کونسل کے پروگرام میں تھیٹر' مصوری' موسیقی کے ساتھ ساتھ بقدر نمک رقص بھی شامل تھا۔ مہاراج غلام حسین کتھک روز شام کو اسی ایک دیرینہ آن بان کے ساتھ چھڑی گھماتے کونسل میں آتے۔ کتھک کی مختصر سی کلاس میں پہنچ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے' چھڑی سامنے رکھتے۔ خوبصورت سی پان کی ڈبیا کھول کر پان یا خالی الائچی منہ میں رکھتے اور کتھک کا درس شروع کرتے۔ ایک صبح میں نے خبر پڑھی کہ آرٹ کونسل میں رقص کی کلاس بند ہو گئی۔ دل میں کہا کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔ آرٹ کونسل کے سارے ہی پروگرام ان دنوں اسلامی حلقوں کی طرف سے سخت تنقید کی زد میں تھے۔ اتفاق سے اسی ہفتے کونسل کی گورننگ باڈی کی میٹنگ تھی۔ اس کا ایک رکن میں بھی تھا۔ کمشنر لاہور آفریدی صاحب چیئرمین تھے۔ میں نے ان کی توجہ اس خبر کی طرف دلائی اور استفسار کیا کہ اس کلاس کو اچانک بند کرنے کا سبب کیا تھا؟ بولے ''خبر غلط ہے۔ ہم نے صرف اتنا

کیا ہے کہ اس کلاس کو تہہ خانے میں منتقل کر دیا ہے تا کہ لوگوں کی نظروں میں زیادہ نہ آئے۔ ویسے آپ اپنے کالم میں یہ ذکر نہ کریں ورنہ پھر شاید کلاس بند ہی کرنی پڑ جائے' ہم پر Pressure بہت ہے۔''

اصل میں اس دباؤ کا مقابلہ جو شخص کر رہا تھا' وہ کوئی دوسرا تھا۔ وہ تھے گورنر پنجاب جنرل جیلانی۔ ویسے تو وہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے رکن رکین تھے۔ لیکن اس شہر کے لیے کچھ اچھے کام کر گئے۔ انہی کا دم تھا کہ آرٹ کونسل نہ صرف اپنے فنون کے پروگراموں کے ساتھ بچ گئی بلکہ اس کی مجوزہ نئی عمارت بھی کھڑی ہو گئی۔

ہاں مجلس ترقی ادب کی ایک میٹنگ مجھے نہیں بھولتی۔ حنیف رامے کی وزارت اعلیٰ کے زمانے میں جب اس مجلس عاملہ کی نئی تشکیل ہوئی تھی تو اس کے نئے اراکین میں محمد سلیم الرحمن اور مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی مجلس کے ڈائریکٹر تھے اور ہیں۔ انہوں نے جو اشاعتی پروگرام منظوری کے لیے پیش کیا' اس میں کلیات میر کے نئے ایڈیشن کی اشاعت بھی شامل تھی۔ ہمارے بزرگ ڈاکٹر سید عبداللہ نے جھرجھری لی۔ پہلے میر سے اپنے عشق کا ذکر کیا' پھر ایک عجب ٹکڑا لگایا۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ اس وقت قوم کو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اس کے اسلامی اور قومی شعور کو بیدار کریں۔ ''کلیات میر'' کو شائع کر کے کیا کیجئے گا۔ ویسے بھی ہندوستان میں تو کلیات چھپ ہی گئی ہے۔

کمیٹی کے سرکاری اراکین نے فوراً ان کی بات کی تائید کی' مجھ سے رہا نہ گیا۔ ان کے بیان کی مقدور بھر مخالفت کی مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنا آلہ سماعت اتار کر الگ رکھ دیا تھا۔ میری کوئی بات ان کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ یہ ان کا خاص طریقہ واردات تھا۔ اپنی بات کہہ کر آلہ سماعت سے اپنے کانوں کو آزاد کر لیتے تھے۔ پھر آپ مار پیچھے پکار کرتے رہیں' ان کے کانوں پر ذرا جوں رینگ جائے۔ کانوں تک بات پہنچتی' تب ہی تو جوں رینگنے کی توقع کی جاتی۔

پھر قاسمی صاحب نے غالب کے نسخہ حمیدیہ کی نئی اشاعت کی اجازت مانگی۔ اب کے پروفیسر غلام حسین' ذوالفقار نے اسی سید صاحب والے استدلال کے ساتھ اس کی اشاعت کی مخالفت کی۔ خیر غلام حسین ذوالفقار سے نبٹنا کسی قدر آسان تھا کہ یہاں نہ بزرگی کا احترام درمیان میں حائل تھا نہ آلہ سماعت۔

کچھ دلچسپ اور عبرت انگیز واقعات ریڈیو پر پیش آئے۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے ریڈیو اور ٹی وی کو ایک ہدایت آئی تھی کہ ان کے پروگراموں میں شراب کا ذکر نہیں آنا چاہیے۔ ایک ادبی مذاکرے میں یوں ہوا کہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے پروگرام کے پروڈیوسر شکور بیدل نے ہمیں سمجھایا کہ بحث میں کوئی ایسا شعر نہ پڑھا جائے جس میں شراب کا ذکر ہو۔ میں نے کہا کہ اگر شراب کا

ذکر ہوتو پھر کیا ارشاد ہے۔ شکور بیدل سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا یار ایسے شعروں سے بھی اجتناب کر ہی لیا جائے تو مناسب ہے۔ میں نے کہا بہر حال جو موضوع زیر بحث ہے اس میں مجھے اقبال کے ''ساقی نامہ'' کا حوالہ دینا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے ساقی نامہ کے باب میں تمہاری ریڈیو پالیسی کیا کہتی ہے۔ شکور بیدل ہاتھ جوڑ کھڑے ہو گئے۔ ''یار مجھ پر رحم کرو۔ میری نوکری کا معاملہ ہے۔''

ہاں حب الوطنی کے تقاضوں نے بھی تو ان دنوں عجب شکل اختیار کر لی تھی۔ اسلامی کلچر پر کوئی بحث تھی۔ میں نے تاج محل کا حوالہ دیا۔ شکور بیدل بے چین ہوئے۔ پروگرام بیچ میں روک دیا۔ کہا کہ ''اوپر سے اعتراض آ جائے گا۔ اس حوالے کو جانے دو۔''

''آخر کیوں؟'' میں نے چڑ کر پوچھا۔

''تاج محل ہندوستان میں ہے ناں۔''

میں نے کہا کہ اس حوالے کو منہا کر کے مسلمانوں کے کلچر اور آرٹ پر بات کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ سو میں اس بحث سے علحیدہ ہوتا ہوں۔ سجاد باقر رضوی بھی اس پروگرام میں تھے۔ وہ گرمی کھا کر فوراً ہی رواں ہو گئے اور ایسے رواں ہوئے کہ مادری اصول، پدری اصول، انفس، آفاق، یونگ سب ہی ان کے استدلال کی لپیٹ میں آ گئے۔ بیچارے شکور بیدل حیران و پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ انہوں نے پھر وہی ہتھیار استعمال کیا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے ''پروفیسر صاحب! میری نوکری کا معاملہ ہے۔''

شکور بیدل غلط نہیں کہتے تھے۔ ان ظالم ہدایات سے بال برابر بھی انحراف ہو جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ ایک ریڈیو کالم میں، میں نے موسم کے میووں کا ذکر کرتے ہوئے کہیں بھٹوں کا بھی ذکر کر دیا۔ ریڈیو کے باریک بینوں کے سامعہ نے درمیان سے نون غنہ غائب کر دیا۔ اوپر رپورٹ پہنچائی کہ فلاں پروگرام میں ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور صاحب پروڈیوسر غریب کی کمبختی آ گئی۔ اس نے ہزار صفائی پیش کی کہ ذکر بھٹو کا نہیں بھٹوں کا تھا۔ افسران اعلیٰ قائل نہیں ہوئے۔ مشکل سے جان بخشی ہوئی مگر اس سزا کے ساتھ کہ وہ پروگرام اس سے لے لیا گیا۔

وہ تو خیر مارشل لاء تھا اور مارشل لاء بھی کونسا؟ ضیاء الحق والا مگر آگے چل کر نام نہاد جمہوری حکومتوں نے بھی اپنے اپنے حساب سے ضیاء الحق کی سنت پر عمل کیا۔ وہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا دوسرا دور تھا۔ میری ایک کہانی کو خالد احمد نے پی ٹی وی کے لیے ڈرامائی جامہ پہنایا۔ اس ڈرامے کے ساتھ عجب ہوا کہ بغیر کسی معذرت یا وضاحت کے اسے بیچ میں روک دیا گیا۔ اشتہار چلنے لگے۔ پھر کوئی دوسرا پروگرام شروع ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ اگلی صبح کو بھید کھلا جب سکرپٹ ایڈیٹر ظہور بھائی حیران و پریشان میرے پاس آئے۔ پتہ چلا کہ ڈرامہ کے بیچ کہیں اوپر سے ہدایت آئی کہ اس ڈرامے کو فوراً روک دو۔ یہ تو کراچی کی صورتحال کے بارے میں

ہے اور پھر پوچھ گچھ ہونے لگی کہ یہ ڈرامہ کس نے پڑھا اور کس نے منظور کیا؟ بیچارے ظہور بھائی کو اب اپنی صفائی پیش کرنی تھی۔ کہانی کے مصنف سے وہ مدد چاہتے تھے۔ کہانی کا مصنف ان کی اس باب میں کیا مدد کر سکتا تھا؟

خیر اس ڈرامے پر تو اس قسم کے شک کا جواز موجود تھا۔ مضحکہ خیز صورتحال میرے ایک دوسرے ڈرامہ کے بارے میں پیدا ہوئی۔ یہ طویل دورانیہ کا ایک کھیل تھا جو (آٹھواں سوال) کے عنوان سے سٹیج پلے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ پی ٹی وی کے تقاضوں پر میں نے ان کی نذر کر دیا۔ بختیار احمد نے بڑے شوق سے اسے تیار کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایسی پروڈکشن ہے کہ دیکھو گے تو دل خوش ہو جائے گا مگر پیش آج ہوتا ہے' نہ کل ہوتا ہے۔ جب خاصے دن گزر گئے تو مجھے کرید ہوئی کہ معاملہ کیا ہے۔ پہلے یہ سن لیجئے کہ اس ڈرامے کی بنیاد قصہ حاتم طائی پر ہے کہ حسن بانو اپنے امیدواروں کے سامنے یہ شرط رکھتی ہے کہ جو اس کے سات سوالوں کا جواب لائے گا' اس سے وہ شادی کرے گی۔ پی ٹی وی کے عاقلوں نے یہ نکتہ نکالا کہ ڈرامہ نگار نے حسن بانو کے پردے میں بے نظیر بھٹو کو پیش کر ڈالا ہے۔ بس پھر کھیل سرد خانے میں چلا گیا۔

اچھا جب شاہد محمود ندیم لاہور سٹیشن کے جی ایم بنے اور انہوں نے مجھ سے کھیل لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ برادر پہلے میرے اس کھیل کا حق حساب کرو جو پی ٹی وی کے سرد خانے میں پڑا ہے۔ اس عزیز نے جلد ہی پیش کر ڈالا اور کوئی قیامت نہیں ٹوٹی۔ پتہ چلا کہ کچھ پابندیاں اوپر سے عاید ہوتی ہیں' کچھ خود پی ٹی وی کے اہلکاروں کے وسوسوں' اندیشوں سے اگتی ہیں۔ مارشل لاؤں کے زیر اثر پل کر نام نہاد جمہوری حکومتوں کے مارشل لائی احکامات سے تربیت پا کر وہ اتنے عقلمند ہو گئے ہیں کہ اب انہیں اوپر والوں کے اشارے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ خود ہی بھانپ لیتے ہیں کہ اوپر والے کیا چاہتے ہیں اور انہیں کیا کرنا ہے۔ بہر حال میں نے اس واقعہ سے سبق لیا اور آئندہ کے لیے ٹی وی کے لیے ڈرامہ لکھنے سے کان پکڑے۔ پہلے بھی میں کون سا اس صنف میں رواں تھا۔ بس کبھی کبھار کا معاملہ تھا' اب اس سے بھی توبہ کر لی۔

خیر تو ذکر ضیاء الحق کے زمانے کا تھا۔ کیا زمانہ تھا۔ ایک طرف نمازوں کا چرچا تھا' دوسری طرف سر عام پھانسیوں اور کوڑوں کا شور تھا۔ میں نے ایک لطیفہ صفدر میر سے سنا تھا کہ جب دلی میں نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تو لاہور میں ایک زندہ دل لاہوریئے نے دوسرے سے کہا کہ بھا جی' ایس ویلے دلی میں قتلام دا میلہ لگا ہے' ہا چلو چلئے میلہ دیکھیں۔ تب سنا تھا' اب دیکھا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے پھانسیوں کا میلہ لگا۔ اسے دیکھنے کے لیے لگتا تھا کہ پورا شہر جیل روڈ پر ڈھل آیا ہے۔ احمد مشتاق کے گھر سے دریا دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے جو اپنا گھر بنایا' وہاں سے جو چیز سب سے پہلے دکھائی دی' وہ پھانسیوں کا تختہ تھا۔ صبح ہی صبح برآمدے میں کھڑے ہو کر

جو ادھر ادھر نظر دوڑائی تو عقبی دیوار کے پرے کیا دیکھتا ہوں کہ جیل کے احاطے میں ہمارے گھر کے رخ مزدور ٹھوک پیٹ کر رہے ہیں۔ مجھے اس گھڑی کب پتہ تھا کہ یہ اصل میں پھانسی کے تختے ہیں جو نصب کیے جا رہے ہیں۔ وہ تو دوپہر ہوتے ہوتے پتہ چلا۔ خلقت ڈھلی چلی آ رہی تھی۔ پھر لوگوں کو ایسی دیواروں اور چھتوں کی تلاش ہوئی جہاں سے یہ تماشا اچھا دکھائی دے۔ کتنے زندہ دلوں نے ہمارے گھر کی چھت کو تاڑا۔ کتنی مشکل سے منت سماجت کرنے والوں کو ٹالا۔ پھر بھی عین پھانسیوں کے وقت میری اپنی چھت پر نظر گئی تو کتنے تماشائی وہاں ڈٹے نظر آئے۔ پتہ نہیں کس طرف سے چڑھ کر آئے۔ میں پریشان ہو ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ میری نظروں سے بے نیاز شوق میں ڈوبے پھانسیاں دیکھ رہے تھے۔ پھانسیوں کے تختوں کی طرف نظر دوڑانے کی مجھ میں ہمت نہیں ہوئی۔ ہراساں و پریشاں اپنی چھت اور اس پر لدے تماشائیوں کو دیکھا کیا۔ پوری تین پھانسیاں لگی تھیں۔ شائقین کو کھلی دعوت دید تھی۔

مگر یہ تو ٹریلر تھا۔ ایسے کئی ٹریلر یہاں وہاں چلے۔ بڑی پھانسی بعد میں لگی مگر اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بس دن چڑھے ضمیمے آئے جن سے پتہ چلا کہ آخر کے تئیں بھٹو صاحب کو پھانسی لگ گئی۔ پورا ملک ہل گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ ادھ مرا بچہ جو بھٹو صاحب کے انتظام میں پیدا ہوا تھا' سانس لینے لگا۔ اکیڈمی آف لیٹرز کا پہلا جلسہ عام اس پھانسی کے ہفتے بھر بعد منعقد ہوا۔ یہ ادارہ بھٹو صاحب کے عہد حکومت میں وجود میں آیا تھا مگر بس اس حد تک کہ دفتر قائم ہو گیا اور احمد فراز اس کے چیئرمین بن گئے۔ ادارہ متحرک ضیا عہد میں ہوا اور ایسا متحرک ہوا کہ سال کے سال اسلام آباد میں ادیبوں کا ایک میلہ سا لگتا۔ لاہور سے لے کر فاٹا تک کے ادیب ڈھل کر آتے اور موج میلہ کرتے۔ پہلا میلہ قدرے پھیکا تھا۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کا واقعہ تازہ تھا۔ دلوں' دماغوں پر اس کا بہت اثر تھا۔ سو کتنے ادیبوں نے اس برس وہاں جانے میں تامل کیا۔ اگلے برسوں میں اس میلہ نے بہت رونق پکڑی۔ مجھے چونکہ کبھی شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا' اس لیے آنکھوں دیکھا حال رقم کرنے سے قاصر ہوں۔ کانوں سنی کتنی سنا سکتا ہوں۔ کتنے ہی شریک ہونے والوں کو یاروں کے بیچ معذرتی لہجہ میں کہتے سنا کہ کیا کرتے مجبوری تھی۔ دھمکی مل گئی تھی' جانا پڑا۔ نوکری خطرے میں تھی۔ میرا ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے' ہر چند کہ ٹرسٹ کی زد میں آتے ہوئے اخبار سے وابستہ تھا۔ اس وقت اکیڈمی کے چیئرمین شفیق الرحمن تھے۔ وہ تو گئو آدمی تھے۔ فعال کردار اکیڈمی کے ڈائریکٹر مسیح الزمان صدیقی ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی بس تقاضے ہی کیے تھے۔ ان کے بعد والوں نے تو زیادہ تقاضے و تقاضے بھی نہیں کیے۔ انہوں نے ناموروں اور گمناموں کا اتنا مجمع اکٹھا کر لیا تھا کہ اکا دکا ادیب اگر شریک بھی نہ ہوتا تو اس سے ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آمروں اور نیم آمر وزیر اعظموں کو سامعین ہمیشہ ہی وافر

مقدار میں میسر رہے مگر آ گئے تو بس وہ سیاسی تقریریں کیا کرتے تھے۔ ضیاء الحق کا ایک شوق یہ تھا کہ سال کے سال ادب پر ایک خطبہ دیتے تھے۔ یہاں بھی انہیں سامعین بہت میسر آئے۔ بڑا ادبی خطبہ۔ اس کے بعد ادیبوں کے اعزاز میں بڑا کھانا۔ ایک برس مشیر ادیبوں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی کہ ادیب آپ کا کھاتے ہیں۔ اوپر سے بلاتے ہیں اور ایسی نظموں' غزلوں اور نثری تحریروں کو ان کے نوٹس میں لایا گیا جن میں ان کے تجزیئے کے حساب سے مارشل لاء کے خلاف اشارے ملتے تھے۔ تب جنرل صاحب نے اپنے خطبہ میں برہمی کا اظہار کیا اور موجود ادیبوں پر جتایا کہ اس کے بعد آپ کو میرا نمک کھانا ہے مگر اس برس نفری اتنی زیادہ تھی کہ سکیورٹی والے چیک کرتے کرتے تھک گئے۔ کتنوں کو انہوں نے ڈائننگ ہال میں گھسنے ہی نہیں دیا۔

◆◆◆

ادب بیبیوں کی گود میں

صاحب! عجب وہ دور تھا کہ ادبی سرگرمی کم ہوتی چلی جارہی تھی اور ادیبوں کی سرگرمیوں میں تیزی آتی چلی جارہی تھی۔ ادب مندے کا شکار تھا لیکن ادیبوں کا کاروبار زور پکڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ پاکستان سے ادب غائب ہوجائے گا' بس ادیب رہ جائیں گے اور عجب صورتحال تھی کہ تخلیقی سرگرمی تو جیسے تھوڑی رہ گئی ہو مگر ادیبوں کی تعداد اچانک بڑھ گئی تھی۔ اکیڈمی آف لیٹرز کی کانفرنسوں کی برکت سے دیکھتے ہی دیکھتے ادیبوں کی آبادی میں کتنا اضافہ ہوگیا تھا۔

ہاں اسی زمانے میں ہمارے ادبی نقشہ میں ایک اور طاقت ابھر کر سامنے آئی۔ ویسے مارشل لاء سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور اکیڈمی آف لیٹرز کا بھی اس میں کوئی احسان نہیں ہے مگر بہرحال یہ واقعہ اسی زمانے میں ظہور پذیر ہوا کہ بیبیاں ہماری دنیائے ادب میں اس طرح متحرک ہوئیں کہ ادب نسوانی کاروبار نظر آنے لگا بلکہ یہاں تک گمان ہونے لگا تھا کہ پاکستان میں اب اگر ادب کو پروان چڑھنا ہے تو وہ بی بیوں کی گود میں پروان چڑھے گا۔ وہی اسے دودھ پلائیں گی، گودوں کھلائیں گی۔ میں ابھی کہہ رہا تھا کہ ضیاء الحق کے سبز قدم ایسے آئے کہ جلد ہی دونوں حلقوں یعنی ادبی حلقہ اور سیاسی حلقہ دونوں کا بستر لپٹ گیا اور ٹی ہاؤس میں ادب موضوع گفتگو نہیں رہا۔ ضیاء الحق کا مارشل لاء یہ تھا' وہاں ادیبوں کا نیا موضوع گفتگو۔ ایسے میں جمیلہ ہاشمی کو ایک جھرجھری آئی۔ ناول، افسانے لکھتے لکھتے انہیں خیال آیا کہ شاعر اچھے ہیں کہ مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔ وہ سناتے ہیں' سننے والے داد کے ڈونگرے برساتے ہیں' فکشن والے اس لطف سے محروم ہیں۔ سو انہوں نے شب افسانہ کی کھچڑی پکائی۔ افسانہ نگاروں کو اکسایا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ کونے میں منہ چھپائے بیٹھے رہتے ہو۔ محفل میں آؤ اور افسانہ سناؤ۔ پہلی ایسی محفل ان کے گھر میں شروع فروری 1977ء میں آراستہ ہوئی۔ انہوں نے کس اہتمام سے اپنے گھر میں فرش فروش بچھائے' گاؤ تکیے سجائے، بیچ میں شمع رکھی۔ ہر ایک کے سامنے ٹھونگنے کے لیے خشک میوے کی طشتری، کھانے کے لیے پائے، سننے کے لیے افسانے۔ پائے پیٹ بھر کر سب نے کھائے۔ افسانے چار افسانہ نگاروں نے سنائے۔ قاسمی صاحب نے، اشفاق احمد نے، اعجاز حسین بٹالوی نے، جمیلہ ہاشمی نے۔

جمیلہ ہاشمی نے اولاً ایک ناول نگار کی حیثیت سے نام پایا۔ پھر ان کے دسترخوان کا چرچا ہوا۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ تھا۔ اس پر مستزاد آموں کا ایک شاندار باغ۔ آموں کی فصل میں ایک آم پارٹی کا اہتمام ضرور کرتیں۔ جاڑوں میں شب افسانہ' اس کے ساتھ

کھانا دانہ۔ ایک اور شب افسانہ یاد آ رہی ہے۔ یہ فروری 1979ء میں آراستہ ہوئی تھی۔ اس میں دو چیزوں کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ گاجر کے حلوے کی اور قدرت اللہ شہاب کے ناول کے باب کی۔ وہاں تو انہوں نے اس قصے کو ناول کے باب کے طور پر ہی پیش کیا تھا۔ ''شہاب نامہ'' کی اشاعت پر پتہ چلا کہ وہ ان کی آپ بیتی کا ایک ورق تھا۔

جمیلہ ہاشمی نے تو اس محفل کا آغاز شب افسانہ ہی کے طور پر کیا تھا مگر شرکائے محفل میں دو روحیں ایسی تھیں جنہوں نے اسے خالص شب افسانہ نہیں رہنے دیا۔ صلاح الدین محمود اور کشور ناہید۔ دونوں کی نظموں کے لیے یہ جواز پیدا کیا گیا کہ ان میں کہانی کا رنگ ہے۔ پھر بیگم ادا جعفری نے کہ ان دنوں اسی شہر میں تھیں۔ ایک محفل شب کا اہتمام کر ڈالا جو شاعری اور افسانہ دونوں سے مالا مال تھی۔

لکھنے والی بیبیوں کے طفیل ایسی محفلوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ بیگم حجاب امتیاز علی نے سوچا کہ یہ محفلیں کسی ضابطہ کے تحت ہونی چاہئیں۔ ان کا کوئی قاعدہ قانون ہونا چاہیے تو انہوں نے ایک چھوٹی سی میٹنگ طلب کی۔ شبانہ محفلوں کا ایک منصوبہ پیش کیا۔ منشور جو انہوں نے مرتب کیا تھا' پڑھ کر سنایا۔ اس سلسلہ کا نام من وسلویٰ رکھا گیا۔ چند شرطیں جو ان کے پیش کردہ پیپر میں بیان ہوئی تھیں' یہ تھیں۔

زیادہ سے زیادہ بائیس حضرات یا بارہ جوڑے اس میں شریک ہوں۔ ہر چاند کی 12 کو یہ محفل بپا کی جائے۔ نیز۔۔۔۔۔۔

1- رائے عامہ کے بعد جگہ کا فیصلہ ہوا۔ کسی کا گھر' کوئی سائبان' کسی جگہ کا پرسکون زینہ' کسی درخت کا سایہ' کنار دریا وغیرہ۔

2- ہر ادیب اور شاعر اپنے ساتھ ایک شمع (یا روشنی کا کوئی اور منبع) ایک نظم' غزل یا کہانی اور ایک پکوان جو کہ چھ متوسط خوراک والے ممبران کے لیے کافی ہو لائے اور چپ چاپ میز پر رکھ دے۔ جاتے وقت خاموشی اور صبر سے اپنے خالی برتن لیتا جائے۔

3- میٹھا ضرور ہو۔

4- جب کسی کا گھر منتخب ہو تو میزبان کا فرض ہے کہ وہ اپنے کھانے کی میز' گرم روٹی یا چاول' موسم کے مطابق مشروب اور برتن وغیرہ پیش کرے اور گھبرائے ہرگز نہیں۔

5- اس محفل میں نظم' غزل' کہانی یا مقالہ تازہ ترین ہو تو بہت اچھا ہے۔ پرانی چیز بھی طوعاً و کرہاً سن لی جائے گی۔ (طویل اور اکتا دینے والی کہانی یا مقالے کسی کانفرنس کے واسطے اٹھا رکھیں)

6- پہلی محفل کے اختتام پر اگلی محفل میں تخلیقات پیش کرنے والوں کا تعین کیا جائے گا۔ اس ضمن میں کسی قسم کا عذر' شرم یا نخرہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔

7- آنے کے وقت کی پابندی کی جائے گی۔ جانے کے وقت پر کوئی پابندی نہیں۔

تجاویز اور شرائط اور بھی تھیں۔ میں نے چند ایک گن چن کر نقل کی ہیں۔ پیپر اس بیان پر ختم ہوتا ہے۔

ایک شام میں نے اپنے ہاں مندرجہ ذیل کو چائے پر مدعو کر کے ان تجاویز کا اعلان کیا اور من وسلویٰ کی داغ بیل ڈالی۔

جناب وبیگم منظور الٰہی' جناب وبیگم صلاح الدین محمود' جناب انتظار حسین' جناب وبیگم نور الحسن جعفری' جناب وبیگم یوسف کامران' جمیلہ ہاشمی گاؤں گئی ہوئی ہیں۔ واپس آ کر شامل ہوں گی۔

حجاب امتیاز علی

صدر وبانی ''من وسلویٰ''

مارچ 1977ء

حجاب امتیاز علی سے میرا تعارف کوئل کے واسطہ سے ہوا۔ میرا مطلب ہے باقاعدہ تعارف ورنہ ویسے تو میں ایک زمانے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے گھر جا کر نہاری بھی بہت کھائی ہے مگر نہاری تو میں وہاں نعیم طاہر کے مہمان کی حیثیت سے کھاتا تھا۔ شاید ایک آدھ دفعہ تاج صاحب نے بھی یاد کیا مگر تاج صاحب کے ہمراہ تو میں انہیں آرٹ کونسل میں بھی کب سے دیکھ رہا تھا۔ ہر کھیل دیکھنے باقاعدگی سے تاج صاحب کے ساتھ آتی تھیں مگر ہمیشہ میں نے انہیں چپ ہی پایا۔ بس اچانک ایک صبح مشرق کے دفتر میں مجھے ان کا فون موصول ہوا ''انتظار صاحب! کیا اس موسم میں آپ نے کوئل کی آواز سنی ہے؟''

اس سوال پر مجھے چونکنا ہی تھا۔ کون اس زمانے میں اس پر دھیان دیتا ہے کہ کوئل کب بولتی ہے اور کب مور جھنکارتے ہیں۔ برا ہو نئے زمانے کا جس نے فطرت سے ہمیں یکسر بیگانہ کر دیا ہے تو خیر میں نے جلدی جلدی نہر کنارے اپنی صبح کی سیروں کو یاد کیا اور کہا ''جی نہیں' ابھی تک مجھے یہ آواز سنائی نہیں دی۔''

''انتظار صاحب! یہ تو بہت عجیب بات ہے۔ اب تو ساون بھی لگ چکا ہے اور کوئل ابھی تک نہیں بولی ہے۔ میں نے کیلی فورنیا خط لکھ کر معلوم کیا' وہاں بھی ابھی تک کوئل نہیں بولی ہے۔''

کیلی فورنیا۔ اس پر میں چکرایا مگر انہوں نے جلد ہی وضاحت کر دی۔ ''بات یہ ہے کہ کیلی فورنیا کی آب وہوا بھی ہمارے علاقوں کی طرح ہے۔ کوئل وہاں بھی ہوتی ہے اور موسم کے حساب سے بولتی ہے مگر اس برس وہاں ابھی تک کوئل کی آواز سنائی نہیں دی ہے اور آپ نے ابھی تک اس پر کالم نہیں لکھا۔ کیوں نہیں لکھا؟''

میں اپنی کوتاہی پر سخت شرمندہ تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ موسم پر جو میں کالم لکھتا رہا ہوں اور درختوں اور پرندوں کے بارے میں جو باتیں کرتا رہا ہوں' اسے وہ باقاعدگی سے پڑھتی رہی ہیں مگر جب اس بہانے تبادلہ خیال کا سلسلہ قائم ہو گیا تو پھر بات موسموں' درختوں اور پرندوں تک محدود نہیں رہی۔ پتہ چلا کہ معاشرتی مسائل و معاملات میں بالخصوص مذہب کے حوالے سے اور عورتوں کے حوالے سے جو اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں' اس میں ان کا شغف بہت ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی اب انہوں نے میری تحریروں کو پرکھنا شروع کر دیا۔ کبھی فون یا خط کے ذریعہ شاباش دی جا رہی ہے' کبھی سرزنش کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک خط ذرا سن لیجئے۔

جناب انتظار حسین! تسلیم

لاہور واپس آئی تو دیکھا کہ آپ کی تحریرات میں ایک حرارت اور زندگی آ گئی ہے جو پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔ شاید اب آپ اپنی جبلتوں سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنی کسی جبلت کا معقول استعمال کرتا ہے تو وہ قابل عزت ہو جاتا ہے۔

آپ کے اخبار ''مشرق'' میں ٹیلی ویژن کے رمضان المبارک کے پروگراموں کی تفصیل دیکھی۔ موسیقی اور ڈرامے بند کر دیئے گئے ہیں۔ تعجب ہوا۔ یہ تو ماتم کی علامات ہیں۔ رمضان المبارک خوشیوں کا مہینہ ہے۔ مسلمان روزے رکھتے' نماز پڑھتے اور اپنے معبود حقیقی کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس میں غم کی کیا بات ہے۔ روزہ دار یہ چاہے گا کہ افطار اور نمازوں کے بعد ٹیلی ویژن پر کوئی ڈرامہ دیکھے' دل پسند موسیقی سنے اور تفریح حاصل کرے۔

غم و الم اور ماتم کا مہینہ محرم کا ہوتا ہے۔ اس مہینے میں موسیقی کوئی مسلمان بھی سننا پسند نہیں کرتا جبکہ محرم کے مہینے میں بعض بے درد لوگ جو اپنے آپ کو بڑا مذہبی بتاتے ہیں' اپنی شادی کی دعوتیں کرتے اور لوگوں کو اس میں مدعو کر کے اس کا اشتہار کرا سکتے ہیں اور اس پر لوگوں کو اعتراض بھی نہیں ہے تو رمضان کے مہینہ میں روزہ داروں کی صالح تفریح پر اعتراض اور پابندی کیوں ہے؟ کیا روزہ رکھنا کوئی جرم ہے کہ اس پر ہر قسم کی پابندی عائد کی جائے۔ اس کا جواب مجھے ضرور سمجھایئے۔

والسلام

حجاب امتیاز علی

یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر اسرار نئے نئے مولویت کے میدان میں اترے تھے اور اسلام کی اپنے رنگ سے تعبیر کر رہے تھے۔ عورتیں خاص طور پر اس تعبیر کی زد میں تھیں۔ آئے دن اخباری بیان جاری کرتے تھے اور ادھر ان کا بیان جاری ہوا اور ادھر بیگم حجاب

کا فون موصول ہوا۔

''انتظار صاحب! آپ نے ڈاکٹر اسرار کا بیان پڑھا۔ آپ اس پر کیا لکھ رہے ہیں؟''

کبھی جواب میں پورا خط لکھ ڈالتیں۔

''میں نے بھی اسلام کے بارے میں تھوڑا غور و فکر کیا ہے۔''

''اچھا'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''میں نے اسلامی نظام کا ایک خاکہ بھی تیار کیا تھا۔ بھٹو صاحب کو بھیجا تھا۔ ان کی طرف سے جواب نہیں آیا۔''

مطلب یہ کہ یہ رومانی روح ویسے تو آسمان کی بلندیوں میں مائل پرواز رہتی تھی مگر زمین پر اتر کر حقیقی معاملات و مسائل سے بھی خوب نبٹتی تھی۔ باقی آسمان کی بلندیوں میں پرواز صرف تخیلی سطح پر نہیں تھی' سچ مچ پرواز کر کے بھی دکھایا۔

ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کہ ''آخر آپ کو ایئر یا پائلٹ بننے کا خیال کیسے آیا؟''

بولیں ''نیلا آسمان مجھے بلاتا رہتا تھا۔ بے حد جی چاہتا تھا کہ کھلی فضا میں بلندیوں میں اڑتی اڑتی نیلے آسمان کو جا چھوؤں۔ اسی جذبے سے سرشار میں فلائنگ کلب میں جا شامل ہوئی اور ایئر پائلٹ بن گئی۔ انتظار صاحب! میں لینڈنگ بہت اچھی کرتی تھی۔ پتہ ہے یہ تربیت میں نے کس سے حاصل کی۔''

''کس سے؟''

''چیل سے۔ چیل میری استاد ہے۔ میں لان میں بیٹھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک چیل اڑتی اڑتی آئی اور لان میں اتر پڑی۔ جس طرح پنجوں کو جوڑ کر وہ نیچے اتری' اس سے مجھے سبق ملا کہ جہاز کو بھی بس اسی طرح اتارنا چاہیے۔''

بلیوں سے انہوں نے کیا سیکھا۔ یہ کبھی نہیں بتایا۔ اگرچہ وہ بلیوں کی عقل و دانش کی بہت قائل تھیں۔ کہنے لگیں ''پتہ نہیں لوگ سیامی بلیوں کے کیوں اتنے شیدائی ہیں۔ وہ تو بہت غبی ہوتی ہیں۔ ہمارے گلی محلوں میں جو بلیاں گھومتی پھرتی ہیں' ماشاءاللہ وہ بہت سمجھدار اور عقل مند ہوتی ہیں۔''

ایک زمانے میں ان کے اردگرد اٹھائیس بلیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ انہیں کے بیچ بیٹھ کر اس شان سے لکھتی تھیں کہ ان کا تخیل نیلے آسمان کی خبر لاتا تھا۔ لیجئے ان کے یہاں منعقد ہونے والی ایک محفل یاد آ گئی۔

''انتظار صاحب۔ کل شام غروب آفتاب کی محفل ہے۔ آپ تشریف لا سکیں گے۔''

''غروب آفتاب کی محفل؟'' میں چکرایا۔

''آپ کو کیا پتہ نہیں ہے کہ کل سال کا آخری دن ہے۔ اس برس کے سورج سے کل ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ میں نے کچھ دوستوں کو جمع کیا ہے۔ آپ بھی آیئے۔''

میں پہنچا۔ سخت ٹھنڈی شام تھی۔ مہمان اندر ٹھنسے بیٹھے تھے۔ بار بار بیگم حجاب باہر سے خبر لے کر آتیں۔ ''دیکھئے دھوپ اب جا رہی ہے۔ یہ اس برس کی آخری دھوپ ہے۔ سورج بس ڈوبنے والا ہے۔ کل جو دھوپ نکلے گی وہ یہ نہیں ہوگی۔ اس سے ملاقات کر لیجئے۔''

مہمان پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے تو انہوں نے ہار کر دروازہ کھول دیا۔ باہر سے سخت ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کچھ مہمان ان کے منہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آئے۔ ان میں' میں بھی تھا مگر افسوس کہ سورج اس وقت تک ڈوب چکا تھا۔ مہمانوں کی اس بے حسی سے وہ کچھ کبیدہ خاطر نظر آ رہی تھیں۔ ایک عادت قائداعظم اور بیگم حجاب میں مشترک نظر آئی۔ کہتے ہیں کہ قائداعظم نے اپنی سج دھج میں قرینہ آخری دنوں تک برقرار رکھا۔ بیماری کے عالم میں بھی اسی طرح شیو کا اہتمام کرتے' اسی طرح کالباس میں قرینہ۔ بیگم حجاب کا معاملہ بھی یہی تھا۔ مینہ بوندی ہو' جاڑا پالا ہو' دکھ بیماری ہو' مجال ہے ان کی سج دھج میں کوئی فرق آ جائے۔ وہی قرینہ' اسی قسم کا نظم وضبط انہوں نے من وسلویٰ میں بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔ اسی لیے ایک ایک شرط جزئیات کی حد تک طے کی۔ من وسلویٰ نے جب سال گزار لیا تو باقاعدہ اس کی رپورٹ لکھی اور بتایا کہ ''اس دوران حجاب امتیاز علی' ادا جعفری' جمیلہ ہاشمی' صلاح الدین محمود' منظور الٰہی' کشور ناہید اور یوسف کامران کے گھروں پر محفلیں منعقد ہوئیں جن میں وقتاً فوقتاً فیض جمیلہ ہاشمی' حجاب امتیاز علی اور انتظار حسین نے کہانیاں پیش کیں اور منظور الٰہی نے مضامین پیش کیے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی' جمیل الدین عالی' محمد خالد اختر' محمد کاظم' امجد اسلام امجد' حبیب جالب' عطا شاد' جمیل جالبی' بیگم سردار جعفری' مختار مسعود اور مستنصر حسین تارڑ بھی محفلوں میں صدر کی اجازت سے بطور مہمان شامل ہوئے۔''

مگر بیگم حجاب کا مطلوبہ قرینہ اور امن وامان یہاں کتنے دن برقرار رہ سکتا تھا کہ یہ تو اصلاً عورتوں کی محفل تھی۔ مرد تو آٹے میں نمک کی نسبت سے تھے۔ اب ذرا تصور کیجئے کہ برتن بھی اکٹھے کھے جائیں تو ضرور کھنکتے ہیں اور یہاں تو بیبیاں تھیں۔ لکھنے والی بیبیاں' کیا کم تھیں کہ ان میں لکھنے والوں کی بیگمات بھی آن شامل ہوئیں۔ جلد ہی کٹا چھنی شروع ہوگئی۔ خیر کشور نے جو سلسلہ شروع کیا تھا' وہ تو ہمارے کلچر کے عین مطابق تھا۔ دیکھئے غیبت تو ہمارے کلچر کا جزو لاینفک ہے اور یہاں من وسلویٰ کے ضابطہ سے مطابق آنے کا وقت